برہان

جلد بست ویکم   شمارہ (۳)

مارچ ۱۹۴۸ء مطابق ربیع الثانی ۱۳۶۷ھ

نظرات

آہ لعلِ شب چراغ ہند

گذشتہ چند ماہ میں، وہ کون سی قیامت تھی جو ہمارے سر پر نہیں ٹوٹی اور مصیبت و ادبار کی ایسی کون سی قسم تھی جو ہندستانی (۱۵ر اگست سے پہلے کے ہندستان) پر نہیں آئی۔ انسانیت کی دھول اُڑی مذہب واخلاق کے قصر رفیع کی اینٹ سے اینٹ بجی، جوہر آدمیت و شرافت کی عبائے زرنگار کا ایک ایک تار بکھر گیا، امن وعافیت کی کتاب کا ورق ورق منتشر ہوا۔ اور آسائش حیات وعزت نفس کی دھجیاں بہیمیت و درندگی کی فضائے تاریک میں پراگندہ ہو کر رہ گئیں۔ لیکن یہ سب کچھ ہونے پر بھی شاید پیر فلک کے ذوق ستم و ایذا رسانی کی تسکین اور اس کے حوصلۂ بیداد کی تشفی نہ ہوسکی کہ اس نے ہندستان کی کلاہِ افتخار کا وہ کوہ نور ہیرا اور خستہ حال انسانیت کی قبائے ناموس کا وہ تکمۂ زریں بھی توڑ لیا جو خود غرضی ونفس پرستی کی موجودہ متعفن دنیا میں ہندستان اور انسانیت دونوں کی امیدوں

اور تمناؤں کا آخری سہارا اور ان کی عظمت رفتہ کی آرزوئے بازیافت کا واحد آسرا تھا

دردیست چرخ نقب زن اندر سرائے غم | آرے بہرزہ قامت او خم نیازہ است
آسودگی مجو کہ کسے را بزیر چرخ | اسباب ایں مراد فراہم نیازہ است
درجامۂ کبود فلک بین و بس بداں | کیں چرخ جز سراچۂ ماتم نیازہ است

وادریغا کہ وہ عدم تشدد کا دیوتا جس نے سخت سے سخت اشتعال کی حالت میں بھی کبھی اپنے دشمن پر انگلی نہیں اٹھائی، امن و عافیت کا وہ منادو داعی جس نے شدید سے شدید غیظ و غضب کے موقعہ پر بھی اپنے مخالف کے لیے کوئی دل آزار کلمہ زبان سے نہیں نکالا، وہ انسانیت کا علم بردار حقیقی جو تعصب و تنگ نظری کے جذبات کی فراوانی کے عالم میں بھی ایک کوہ استقامت اور صبر و تحمل کی چٹان بنا اپنے مقام پر کھڑا رہا، مذہب و اخلاق کا وہ پیکر زریں جس نے حیوانیت و درندگی کے بحران عظیم میں بھی اپنے قدم کو ایک لمحہ کے لیے جادۂ مستقیم سے متزلزل نہیں ہونے دیا۔ اور حق و صداقت کا وہ سچا پجاری جو کذب و افترا اور دروغ و باطل کی بلا انگیز موجوں میں بھی صحت فکر و عمل اور راست گفتاری و راست کرداری کی کشتی کو طوفان زدگی سے بچانے کی کوشش کرتا رہا آہ! صد آہ کہ ۳۰ جنوری ۱۹۴۸ء کی شام کو خود اس کے ایک ہم وطن و ہم ملک نے اس کی زندگی کا چراغ گل کر دیا اور اس کے نحیف و زار جسم کو اپنی گولی کا نشانہ بنا کر ہندستان کی پیشانی پر ایک ایسا بدنما داغ لگا دیا جو کبھی مٹائے نہ مٹے گا

گاندھی جی نسلاً ہندستانی اور مذہباً ہندو تھے۔ لیکن وہ انسانیت عامہ کا اتنا بلند اور اعلیٰ تصور رکھتے تھے کہ دنیا میں اگر کسی انسان کے پاؤں میں کانٹا بھی چبھتا تو اس کی چبھن اپنے دل میں محسوس کرتے تھے۔ زمین کے کسی گوشہ میں بھی کسی پر ظلم ہوتا تو وہ اس کی تڑپ سے خود بے چین ہو جاتے تھے۔ ان کے اعتقاد میں رنگ و نسل، مذہب و مشرب اور فکر و خیال کا اختلاف محض ایک ثانوی حیثیت رکھتا تھا۔ انسانیت عامہ اور عالمگیر اخوت و برادری کا رشتہ ان کے نزدیک سب سے مقدم تھا۔ وہ ہر انسان کو دوسرے انسان کا بھائی یقین کرتے اور اس کے ساتھ وہی معاملہ کرنے کی تلقین کرتے تھے، عدم تشدد اور سچائی جس کا حاصل یہ ہے کہ خود اپنے ساتھ انصاف کرو اور دوسروں کے ساتھ انصاف کرو۔ ان کے تمام افکار و اعمال کی اساس و بنیاد تھے۔ انہوں نے نصف صدی کے قریب ہندستان کو غلامی کی زنجیروں سے آزاد کرانے کے لیے ان تھک جد و جہد کی اور آخر کار اس میں کامیاب ہو کر رہے۔ لیکن ان کی یہ جد و جہد قومیت کے تنگ نظرانہ تصور پر ہرگز مبنی نہیں تھی اور ان کا مطالبۂ آزادی اس لیے نہیں تھا کہ وہ ہندستانی ہونے کی وجہ سے انگریزوں سے نفرت رکھتے اور ان کو اپنا دشمن

سمجھتے تھے نہیں بلکہ جیسا کہ انہوں نے بار بار کہا ہے اور اسے اپنے عمل سے ثابت بھی کر دکھایا۔ وہ انگریزوں کے بھی ایسے ہی دوست اور خیر خواہ تھے جیسے کہ وہ اپنے یا اپنوں کے تھے اور ان کا مطالبۂ آزادی صرف اس لیے تھا کہ وہ اس کو ہندستان کا طبعی اور قدرتی حق سمجھتے تھے۔ یہی وجہ ہے کہ اتنا بڑا وسیع اور زرخیز ملک اس طرح آزاد ہو گیا کہ قوت حاکمہ کے کسی فرد کی ناک سے نکسیر بھی نہیں پھوٹی۔ اس میں کوئی شبہ نہیں کہ گاندھی جی کا یہ کارنامہ اس درجہ حیرت انگیز اور عظیم الشان کارنامہ ہے کہ آئندہ نسلیں تاریخ میں اس کو پڑھیں گی اور گاندھی جی کی عظمت و فکر و عمل کا اعتراف کریں گی۔

گاندھی جی اگرچہ ایک خاص ملک کی پیداوار تھے اور ایک خاص مذہب سے متعلق سمجھے جاتے تھے۔ لیکن انہوں نے اپنے "سچائی" کے اصول پر شدت کے ساتھ عامل ہونے کی وجہ سے کسی حقیقت کو محض تقلیداً اور دوسروں کی پیروی میں کبھی قبول نہیں کیا وہ دل و دماغ کی پوری وسعتوں کے ساتھ حق و صداقت کی تلاش و جستجو میں ہمیشہ سرگرداں رہے اور جہاں کہیں ان کو کسی گوہر گراں مایہ کا سراغ ملا اس کو کسی کی ملامت و تردید کے خوف کے بغیر فوراً حفاظت و احتیاط کے ساتھ چن لیا۔ اس بنا پر ان کی شخصیت مذہب و فلسفۂ اخلاق کی مختلف صداقتوں اور سچائیوں کا ایک حسین و لطیف مجموعہ بن گئی تھی اور ان کو ہر شخص اپنے سے بہت قریب محسوس کرتا تھا۔ ہندوؤں کو ان میں رام چندر جی کی حق پرستی و صداقت شعاری نظر آتی تھی تو مسلمانوں کو ان میں خواجہ معین الدین اجمیری اور خواجہ قطب الدین بختیار کاکی کے فقر و مسکنت اور درویشی و بے نفسی کا جلوہ دکھائی دیتا تھا۔ عیسائی ان کو مسیحی تعلیمات کا علم بردار سمجھتے تھے تو سکھ ان میں گرونانک کے جرأت اخلاق اور بے باک صداقت کا پرتو دیکھتے تھے غرض یہ کہ وہ اپنے فکر و عمل کے اعتبار سے ایک ایسے گل صد رنگ و صد بہار تھے کہ جس مذہب کا پیرو بھی ان کو دیکھتا بے ساختہ پکار اٹھتا تھا

اے گل بہ تو خرسندم تو بوئے کسے داری

پھر وہ بدنصیب جن کے مذہب کی اصل اخلاقی اور تمدنی تعلیمات کا تعصب و تنگ نظری کے ہاتھوں خاکہ اڑ چکا ہے وہ تو اس مجموعۂ رنگ و بو اور پیکر اخلاق و حسن خو کو دیکھ کر دم بخود ہو جاتے اور یہ کہہ کر رہ جاتے تھے کہ

مجھے خندۂ گل پہ آتا ہے رونا کہ اس طرح ہنسنے کی خو تھی کسی کی

ان کی اس ہمہ گیر محبوبیت اور ہر دل عزیزی کا ہی یہ ثمرہ ہے کہ کتنے ہی آدمی بلا اختلاف مذہب وملت حادثۂ فاجعہ کی خبر سنتے ہی شدتِ الم میں دنیا سے چل بسے اور کتنے ہی تھے جو زندگی سے بیزار ہو کر خودکشی پر آمادہ ہو گئے۔ پھر ماتم بھی اس درجہ عالم گیر ہوا کہ دنیا میں آج تک کسی کا نہیں ہوا۔ ہر طبقہ اور ہر فرقہ کا، ہر رنگ اور ہر نسل کا، ہر ملک اور ہر قوم کا چھوٹا بڑا، عالم وجاہل، امیر وغریب، مذہب پرست اور لامذہب کوئی ایسا نہیں تھا جس کے دل پر اس حادثہ کو سن کر چوٹ نہ لگی ہو اور اس کی آنکھیں اشک بار نہ ہو گئی ہوں۔ لوگ فرطِ محبت وعقیدت میں ان کو باپو کہتے تھے اور کوئی شک نہیں کہ وہ بنی نوعِ انسان کے سچے ہمدرد وغم گسار ہونے کی باعث نہ صرف ہندوستان کے بلکہ کل کائناتِ انسانی کے باپو تھے آج وہ دنیا سے اٹھ گئے ہیں تو ایسا محسوس ہوتا ہے کہ انسانیت کے سر پر سے قلبی شفقت وپریم کا ایک مقدس ہاتھ اٹھ گیا۔

اس موقعہ پر ہمیں یاد آیا کہ مشہور صوفی اور بزرگ حضرت مولانا جلال الدین رومی کا جنازہ جب قونیہ میں اٹھا تو جہاں مسلمان چیخیں مار مار کر رونے لگے۔ عیسائی اور یہودی بھی بے ساختہ اشک بار ہو گئے لوگوں نے ان سے پوچھا کہ تم کیوں رو رہے ہو۔ عیسائیوں نے کہا کہ تمہارے نزدیک یہ بزرگ ہستی پیغمبر اسلام (صلی اللہ علیہ وسلم) سے شبیہ تھی تو ہمارے لیے یہ حضرت عیسیٰ تھی۔ یہودی بولے کہ ہم کو اس شخصیت میں حضرت موسیٰ کا سا تقدس اور ان کی سی خو بو نظر آتی تھی۔ واقعی سچ فرمایا "جو خدا کا ہو گیا ساری دنیا اس کی ہو گئی"۔

ہندوستان میں اختلافِ مذہب کی وجہ سے پچھلے دنوں جو خون خرابہ ہوا اس کی نظیر تو تاریخ میں نہیں ملیگی لیکن اس میں شبہ نہیں کہ اس ملک پر جب مسلمان بادشاہوں کی حکومت تھی یہ مسئلہ اس زمانہ میں بھی چند در چند مشکلات کا باعث بنا ہوا تھا اور اس کے حل کرنے میں جو پیچیدگیاں پیدا ہوئی تھیں اس کی بڑی وجہ یہ تھی کہ مسلمان بادشاہ خالص اسلامی فکر کے بالمقابل اپنی اصل قومی عصبیت کے رجحانات کو زیادہ اہمیت دیتے تھے یا بالفاظ صحیح تر ہنگامی جذبات کی اشتعال پذیری کے عالم میں اصل اسلامی احکام کو نظر انداز کر دیتے تھے۔ جب سلطنت کی طرف سے اس مسئلہ کا کوئی حل پیدا نہیں ہو سکا تو مسلمانوں میں صوفیائے کرام اور ہندوؤں میں ان کے مصلحین ومفکرین کی جماعت نے وقتاً فوقتاً اس گتھی کو سلجھانے کی کوشش کی چنانچہ اس سلسلہ میں سکندر لودھی کے عہد میں بھگتی تحریک کا آغاز ہوا اور کبیر داس اور بابا نانک جیسے لوگ اس کے علم بردار ہوئے۔ پھر بعد میں اکبر نے دین الٰہی کی داغ بیل بھی اسی تحریک کے زیر اثر ڈالی لیکن ان تحریکوں کو اس لیے فروغ نہیں ہو سکا کہ انہوں نے مذہب کی انفرادیت کو برباد کر کے ایک نئی چیز پیدا کر دی جو کسی خاص مصلحت کے پیش نظر خواہ کتنی ہی خوبصورت اور جاذبِ نظر معلوم ہوتی ہو۔ لیکن کوئی اپنے مذہب کا سچا پرستار اسے قبول نہیں کر سکتا تھا۔

اس راہ سے ہٹ کر گاندھی جی نے اختلافِ مذہب کی مشکل کا جو حل نکالا وہ بالکل طبعی اور فطری تھا

انہوں نے ہندو یا مسلمان، عیسائی یا سکھ کسی سے یہ نہیں کہا کہ وہ اپنا مذہب ترک کر کے کوئی نیا مذہب اختیار کرلے۔ بلکہ ان کا بنیادی فکر یہ تھا کہ تمام مذاہب میں بنیادی صداقتیں اور سچائیاں ایک ہیں جسم اور قالب کے اعتبار سے شکلیں کتنی ہی مختلف ہوں لیکن روح سب کی ایک ہے یعنی یہ کہ وہ خدا پرستی اور نیک زندگی بسر کرنے کی تلقین کرتے ہیں۔ پس جب روح سب مذاہب کی ایک ہے اور انسانیتِ عامہ کے تصور کے پیشِ نظر ہر انسان دوسرے انسان کا بھائی ہے تو پھر محض اختلافِ مذہب کی بنا پر آپس میں لڑنا جھگڑنا اور ایک دوسرے کو برا بھلا کہنا کیوں کر جائز ہو سکتا ہے۔ گاندھی جی کا سب سے بڑا کمال یہ ہے کہ انہوں نے مذہبی رواداری اور ایک دوسرے کے مذہب کے احترام کا جذبہ پیدا کرنے کے لیے اپنی پرارتھنا میں جس کو وہ ہر روز بڑی پابندی سے مجمع عام میں کرتے تھے، ہر مذہب کی مقدس کتاب کے ٹکڑے شامل کر لیے لیکن اپنی ہمہ گیر عظمت و شہرت کے باوجود نہ تو کوئی نیا مذہب ایجاد کیا اور نہ انہوں نے کسی مذہب کے پیرو کو اپنا مذہب ترک کرنے کی دعوت دی۔ اس کے برخلاف ان کا یہ پیغام تھا کہ ہر شخص کو اپنے مذہب کی پابندی کر کے صحیح معنی میں خدا پرست ہونا چاہیے۔ یہ حقیقت ہے کہ اگر ہر شخص واقعی طور پر خدا پرست ہو جائے تو اختلافِ مذہب کی وجہ سے جو بربادیاں آتی ہیں وہ نہ آئیں اور لوگ ایک دوسرے کے ساتھ رواداری، محبت اور ہمدردی کے ساتھ زندگی بسر کر سکیں

گاندھی جی کی زندگی کا سب سے بڑا مشن عدم تشدد اور سچ کی تعلیم تھا دیکھنے میں یہ دو لفظ ہیں لیکن ان میں اخلاق و موعظت کے دفاتر پوشیدہ ہیں گاندھی جی جس چیز کو عدم تشدد کہتے تھے وہ وہی ہے جس کو قرآن نے آیت ذیل میں بیان کیا ہے۔

اِدْفَعْ بِالَّتِیْ هِیَ اَحْسَنُ فَاِذَا الَّذِیْ بَیْنَكَ وَ بَیْنَهٗ عَدَاوَةٌ كَاَنَّهٗ وَلِیٌّ حَمِیْمٌ	ایک ایسے طریقہ پر مدافعت کرو جو بہترین ہو اور جس کا نتیجہ یہ ہو کہ تمہارا شدید دشمن بھی یکا دوست بن جائے۔

ہتیاروں اور تشدد کے ذریعہ صرف جسم کو فتح کیا جا سکتا ہے۔ مگر دل نہیں بدلے جا سکتے۔ اس کے برخلاف اگر کوئی شخص کسی حق بات پر محض حق کے لیے قائم ہو اور وہ زبردست اخلاقی طاقت کا مظاہرہ کرے تو شدید ترین دشمن بھی رام ہو کر دل سے دوست بن جاتا ہے۔ کوئی شبہ نہیں کہ قرآن کی اور ہر آسمانی مذہب کی یہی تعلیم ہے لیکن گاندھی جی نے اپنے بلند پایہ کردار، عظیم الشان ضبطِ نفس اور حیرت انگیز قوتِ عزم و عمل سے جس طرح اس حقیقت کو سچ کر دکھایا وہ مصلحین عالم کی تاریخ میں ہمیشہ روشن حروف میں لکھے جانے کا مستحق ہے۔

۹ ستمبر ۴۷ء کو وہ دہلی پہونچے تو تمام شہر قتل و غارت گری کے شعلوں میں لپٹا ہوا تھا۔ حکومت اور اس کی پولیس اور فوج اس آگ پر قابو پانے میں ناکام رہی تھی۔ لیکن گاندھی جی کے یہاں پہونچتے ہی ایسا محسوس ہوا کہ گویا آگ پر کسی نے پانی ڈال دیا ہے لیکن اس کے باوجود دلوں میں نفرت و عناد اور جذبۂ قتل و غارت گری کا جو زہر بھرا ہوا تھا وہ نہ نکلا گاندھی جی نے پرارتھنا میں روزانہ تقریریں کیں بیانات شائع کیے پرائیویٹ مجلسوں میں افہام و تفہیم کی کوشش کی لیکن جب دیکھا کہ دل پھر بھی نہیں بدلے تو انہوں نے حق و انصاف